33

سلسلہ مطبوعات (۳۳)

جدوجہدِ آزادی کا رہنما ادارہ

مولانا قاری محمد طیبؒ

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

باسمہ تعالیٰ

حرف اول

برعظیم ہند کی آزادی کیلئے طویل جدوجہد کا جب بھی تذکرہ ہوگا، اس میں اس آزادی خواہ جماعت کا ذکر بھی لازماً ہوگا جس نے انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہی انگریز سامراج کے خلاف علم حریت بلند کردیا تھا، اس جماعت نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک غیر معمولی استقامت، بے نظیر بیدار مغزی اور بے مثال جہد مسلسل کا ایک انمٹ باب تاریخ کے صفحات پر رقم کردیا ہے۔

اس سفر آزادی میں نظریات پر پختگی اور جماؤ کے ساتھ حصول آزادی کی تکنیکیں بدلتی رہیں جو روح عصر سے واقفیت کی آئینہ دار تھیں، چنانچہ شاملی کے میدان میں مسلح جدوجہد کے مرحلے سے گزرنے والے اہل حق نے حالات کے تیور بھانپتے ہوئے انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں تعلیمی حکمت عملی اپنائی جو "دار العلوم" کی شکل میں سرزمین دیوبند پر جلوہ گر ہوئی۔

یہ دارالعلوم محض تعلیمی درسگاہ نہ تھا اور نہ ہی کسی مخصوص مذہبی مکتب فکر کو پروان چڑھانے کی آماجگاہ بلکہ حریت فکر و عمل کی تربیت کا مرکز تھا، سامراجی حلقوں کے پروپیگنڈے اور نادان دوستوں کے طرز عمل نے اس کی اس شناخت کو کافی حد تک دھندلانے کی کوشش کی ہے۔

زیر نظر پمفلٹ میں دارالعلوم کے بنیادی آٹھ اصولوں کے تناظر میں دارالعلوم کے مقصد تاسیس کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہی "اصول ہشت گانہ" اس ادارہ کی پہچان ہیں، آیئے اس عظیم مرکز حریت کے مقاصد اساسی کا مطالعہ کرکے بے بنیاد غلط فہمیوں کے ازالہ اور بے مقصد لن ترانیوں کے انسداد کی طرف قدم بڑھائیں۔

چیئرمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آزادیٔ ہند کا خاموش رہنما

دار العلوم دیوبند

آج بر عظیم پاک و ہند کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے، اور کوئی شبہ نہیں ہے کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی جبکہ آزادی ہی ہر خوشی کا سر چشمہ ہے۔ لیکن آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی، اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی، بلکہ کتنے ہی صبر آزما دنوں، مہینوں اور سالوں، کتنے ہی دار و رسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹھروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخی میں آزادی کا پارسل ہمیں بیک دم اور پُرامن طریق پر اچانک شب کے بارہ بجے موصول ہو گیا، لیکن کتنے تاریک سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا کتنے ہی آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔ ایسے اہم سوالات ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے جو آزادی کے اولیں علم بردار تھے تو نہ آزادی کی خوشی ہی مکمل ہو سکتی ہے اور نہ یہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے کیونکہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی کے غموں اور غم خواریوں کی اساس پر کھڑی ہوئی ہے، اگر وہ قید و بند اور

دار و رسن کا غم نہ کھاتے تو یہ آزادی کی خوشبو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی۔ اس لیے ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ روشوں کے تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے موقعہ پر سرفروشی کے جوہر دکھلائے اور ایثار و قربانی سے گو اپنے کو ختم کرلیا مگر آنے والی نسلوں کے لیے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضائیں ہموار کرگئے ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھرپور ہے۔

حضرت نانوتوی بحیثیت مجاہد و مربی

میں اس موقعہ پر ایک ایسی نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا اور نہ صرف ایک ہیرو بلکہ امیر لشکر و سپہ سالار فوج کی حیثیت سے شاملی کے میدان جنگ میں پیش قدمی کی کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آتیں بلکہ جنگ کی فتح و شکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اصولی شاہراہ ڈال دی جس سے جماعتیں کی جماعتیں آزادی کے میدانوں میں مارچ کرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ بلکہ دلوں اور دماغوں کی تربیت ہی آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ زبان و قلم اور آزادیٔ ملک و ملت کے جذبات کی اساس پر ہوتے رہنے کی راہ پڑ گئی۔ اور جو فتح شاملی کا میدان کارزار تیغ و سناں سے نہیں پاسکا تھا وہ ان اصول کے ہتھیاروں سے قلم و زبان کے میدان میں نظر آگئی اور نظر بازوں سے ہمکنار ہو گئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ، بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی ذات گرامی ہے جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ کے دل و دماغ کے اور علماً و عملاً امداد اللہی لسان (ترجمان) کی حیثیت سے اولا

شاملی کے ۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے اور اس ہنگامہ راست و خیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم و عمل کی رونمائیوں کے لیے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

میدان شاملی اور دارالعلوم دیوبند

گویا شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے، فرق تیغ و سنان و قلم و زبان کا تھا، وہاں تشدد (جنگ) کے ساتھ آزادیٔ ملک و ملت اور آزادیٔ مذہب و دین کا نصب العین سامنے تھا اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی، اخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا وہاں اس نصب العین کے لیے افراد استعمال کیے جارہے تھے اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے وہاں نام میدانِ جنگ کا تھا اور یہاں نام مدرسہ اور مکتب امن و صلح کا تھا۔ وہاں قلب و دماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کررہے تھے اور یہاں براہِ راست دل و دماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔

غرض حضرت والا نے میدان شاملی کے نتائج پیش رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اور اس کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز پر اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکا تھا وہ اب ہوجائے۔

قومی جمہوری انداز فکر

حضرت والا نے دارالعلوم دیوبند بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے تمام دینی مدارس کے لیے آٹھ اصول کا ایک دستور اساسی مرتب فرمایا جو دارالعلوم کی معنوی تاسیس تھی اس کی ہشت گانہ (۸) دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے اور جو ایک طرف اگر علاقہ خواص پر مشتمل تھا تو دوسری طرف اس کی روح رابطۂ عوام تھی، ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔

حضرت والا ان اصول کے راستہ سے قوم کو حکومت وقت اور امراء عصر سے بے نیاز ہو کر حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے کیونکہ جو قوم خود اپنی قدرت سے قادر نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر جیتی ہے۔ اور وہ جینا زندگی نہیں موت بصورت حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم ملک و سیاست کے ساتھ علم و اخلاق اور ذہن و فکر میں بھی خودارادیت باقی نہ رہا تو اس قوم کی بنیاد ہی منہدم ہوجائے گی۔ اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار بن کر نہ ابھر سکے گی۔ اس لیے حضرت والا کے نزدیک قوم سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالہ کی واحد تدبیر ہی یہ تھی اور واقعتہً یہی تھی کہ قوم کو علم و دین کے راستہ سے اجتماعیت کی لائنوں پر ڈال دیا جائے۔

اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تعلیم و تربیت کے نظام کو شخصیاتی لائن کے بجائے جماعتی اصول پر قائم کیا جائے تاکہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہوجائے اور دوسری طرف اس تعلیم اور نظم تعلیم کے پروردوں میں دینی حدود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہوجائے۔

حضرت والا دل کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو ابھارنے والا ہے حکمرانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں اگر یہ صورت حال خودرَو طریق پر ہوئی تو اس عوامیت میں لادینی کے جراثیم کارفرما ہوجائیں گے۔ جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہوجائیں گی اور اس کا قومی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔

اس لیے آپ نے اس ادارہ میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی اور نظام تعلیم یعنی نظم ادارہ کے اصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے تاکہ دین اور نظم دونوں کے مجموعہ سے قوم میں دینی خوداختیاری کی قوت پیدا ہوجائے۔ کہ الملک و

الدین توأمان (ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں) ایک سے دوسرا جدا نہیں ہوسکتا۔

حضرت والا کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصول لکھتے وقت آپ گویا شاملی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں، قوم کی ہزیمت و شکست کا منظر آپ کے سامنے ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت متسلط شکست خوردہ قوم کے حقوق آزادی کو کچل رہی ہے اور اس کے قومی تشخص اور حق خودارادیت کو اور ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں کو جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جن کا سلسلہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی شروع ہوچکا تھا۔

سیاسی مقابلہ کی حکمت عملی

حضرت والا نے ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے تلوار کا مقابلہ کا وقت نہیں ہے تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کرلیتے ہیں اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدانِ مقابلہ میں آجاتے ہیں۔ گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا صرف رخ بدلا ہے اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔

اس ٹھنڈے مقابلہ کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی جبکہ اسے ناتربیتی اور لاتعلیمی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لیے اس جدید اقدام میں تعلیم و تربیت کے راستہ سے قدیم ناتربیتی اور لاتعلیمی کے اثرات زائل کرنے تھے احساس کمتری کو دلوں سے دور رکھنا تھا تاکہ حوصلوں میں فرق نہ آجائے۔

دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت، صفائی قلب، پاکیزگیٔ نفس اور جذبات حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی تاکہ آزادیٔ ضمیر کی روح اس میں مستحکم ہوجائے۔

اور تیسرا قدم علم و عمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریت نفس اور آزادیٔ

ملک و ملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا جن میں فکر و بصیرت کے ساتھ اخلاص و ایثار اور قوم پروَری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دارالعلوم کے یہ بنیادی اصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرت نے اس وقت وضع فرمائے جبکہ نئے تسلط و اقتدار کے زیر اثر سر بر آوردگان ملک عوام کے جذبات سے الگ ہو کر طاقت متسلطہ کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے "حریت کاری" کے بجائے "وفاداری" کا خمار خود سروں کے سروں میں بھر چکا تھا اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے حضرت کے اس وقت ان آٹھ اصول کے راستہ سے استغنائی رنگ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعہ عوام کو ابھارنے اور مضبوط بنانے کا پروانہ ڈالا اور ملک کے اونچے طبقہ سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اصول کے راستہ سے کرلیا۔

ان اصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں یعنی دارالعلوم دیوبند اور اس کی فروعات (شاخوں) سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کونے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں علم و اخلاق اور قال اللہ و قال الرسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟ اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی لائنوں میں ان اصول نے کیا اثر دکھلایا اور اس دارالعلوم سے علمی تنظیم کی صورت سے اجتماعی رجحانات اور ان کے عملی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے۔

سو ان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لیے پہلے ان اصول ہشت گانہ کا متن پڑھیے اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھیے۔

اصول کا متن جو حضرت والا کے قلم کا لکھا ہوا خزانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے، حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے۔

وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ PUBLIC COOPRATIVE EDUCATIONAL INSTITUTIONS مبنی معلوم ہوتے ہیں

اس عنوان کے نیچے حسب ذیل آٹھ اصول قلم بند فرمائے گئے ہیں۔

۱۔ اصل اول یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیرِ چندہ (عوامی مالی اعانت) پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ ابقاء طعام طلبہ مل کر افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہوسکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی تر رہیں۔

۳۔ مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بناء میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہِ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کی پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس لیے ضرور ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کے بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بہ دل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہوا تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

۴- یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵- خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہوچکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہوجایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶- اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسی جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۷- سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸- تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

ان اصول ہشت گانہ کی رو سے حضرت والا نے

عوامی ادارہ

۱- سب سے پہلے اس ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا تاکہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی کا کہلانے کے بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہ راست عوام ہی سے رکھی جس کا سلسلہ واسطہ بلاواسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ کسی وقت بھی ادارہ عوام

اور جمہور سے مستغنی (بے پرواہ) نہ ہو اور عوام کی توجہ کسی آن ادارہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیر چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تا کہ جس رفتار سے چندہ بڑھے اسی رفتار سے ادارہ کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چنانچہ اسی اصول کی روشنی میں اس ادارہ کی مجلس شوری کو (جو ادارہ کے نظم و نسق کی ذمہ دار ہے) وکیل اہل چندہ اور مالیات میں نمائندہ عوام قرار دیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عوام صرف چندہ دہندگان ہی نہیں بلکہ بواسطۂ مجلس شوری اس کے مالی مصارف کے نگران اور مجوزہ (تجویز کنندہ) بھی ہیں اور اول سے آخر تک ادارہ میں انہی کا عمل دخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی یا حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اصول کیا اس سے کچھ مختلف ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دور میں انقلاب کا بنیادی اصول رابطۂ عوام کے سوا اور کیا ہے؟ اور اس رابطہ کی صورت آخر اس کے سوا کیا ہوتی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کر کے ان کی قوت سے کام لیا جائے اور انہی کے حصہ رسد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر رکنیت کی فیس رکھ دی۔ کانگریس رونما ہوئی تو اس نے بھی عوام کی ۴؍ کی ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں ابھریں تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا جس سے انقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والا نے آج سے سو برس پہلے جب کہ رابطۂ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ عوام کا ادارہ قائم کر کے عوام کو فیس رکنیت کے عنوان کے بجائے عوامی چندہ کے نام پر ادارہ سے وابستہ کیا۔

اسی طریق کار کو بعد کے مبصروں نے مدارس کے بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے اپنایا۔ فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی اور اس ادارہ

کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا اور اس ادارہ نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا۔ جس میں آزادیٔ وطن کے ساتھ آزادی مذہب وملت کی روح بھی قائم رکھی۔

بہرحال اس اولین اصول کی روح اس عوامی چندہ کی جدوجہد سے ملک کے عوام اور غرباء سے زیادہ سے زیادہ رابطہ قائم کرنا تھا تاکہ ادھر تو عوام اس ادارہ کو اپنی چیز سمجھیں اور ادھر اس علمی ادارہ سے وابستگی کے راستہ سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ جب کہ ہر قوم میں اکثریت عوام اور غرباء ہی کی ہوتی ہے اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں اور اسی لیے ہر اجتماعی کام کا مدار رائے عامہ پر ہوتا ہے اس لیے اصول مذکورہ کی رو سے عوام یا رائے عامہ کو پشت پر لے کر درحقیقت آزادیٔ ملک وملت کی ایک بنیادی قسط حاصل کرلی گئی اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا جو اس ادارہ نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

عوامی تعاون کا حصول

۲۔ اسی کے ساتھ دوسرے اصول میں قوم کے غریب بچوں یعنی طلبہ کی امداد طعام وغیرہ اور اس کی افزائش و تکثیر (بڑھوتری و اضافہ) ضروری قرار دی تاکہ ان کی دلجمعی اور وابستگی کے واسطہ سے قوم اور ملک کو اس ادارہ سے وابستگی روز بروز بڑھتی رہے گویا پہلا اصول اگر رابطہ عوام کا رکھا گیا جو پچاس برس بعد انقلابوں اور جمہوری حکمرانیوں کی اساس بننے والا تھا تو دوسرے اصول میں عوام کو خود بھی ادارہ کی طرف بڑھنے کا موقعہ دیا تاکہ اس دوطرفہ رابطہ سے اتحاد باہمی کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائینوں کے افراد کی طرف سے اس عوامی چندہ کی تحصیل وصول اور غریب طلبہ کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھک منگے تیار کرنے سے تعبیر

کیا گیا کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لیے چندہ کے ادارہ کا قیام ایک نئی چیز تھی اور سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ دارالعلوم ہی تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا، لیکن حضرت والا اپنے نور فراست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور اس سرکاری امداد کا بدل بجز قومی چندہ کے دوسرا نہیں۔ اس لیے ان مطاعن (طعنوں) کی پرواہ کیے بغیر آپ نے انگریزی سرکار کے علی الرغم ادارہ کو اس لائن سے آگے بڑھایا۔ مگر زمانہ کی رفتار نے بہت جلد اس رابطۂ عوام کی ضرورت و اہمیت سمجھادی اور یہ "بھیک مانگنے اور بھک منگے بنانے کا سسٹم" بالآخر ہر قوم پرور کو اختیار کرنا پڑا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس بارہ میں دارالعلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولیں اصول عملی طور پر دنیا کے سامنے لا رکھا۔

شورائی ادارہ

۳۔ رابطہ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقہ خواص (مخصوص افراد کا تعلق) بھی ناگزیر تھا حضرت والا نے تیسرا اصول تالیف خواص (مخصوص حضرات کی دلداری) کا رکھا۔ جس کی رو سے اس ادارہ کو شخصیاتی یا انفرادی رکھنے کے بجائے شورائی قرار دیا تاکہ اس کے کام شخصی ہونے کے بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں۔ کیونکہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اٹھ جانے سے ختم ہوجاتے ہیں لیکن جماعتی کام افراد کے اٹھتے رہنے کے باوجود بقاء پذیر رہتا ہے۔

ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے رد و قبول کا معیار بھی کھول دیا (واضح کردیا) کہ شورائی ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت و ایثار لیے ہوئے ہوں اجتماعیت کا مذاق (مزاج) رکھتے ہوں۔ بات کی پچ اور سخن پروری کی خو نہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے تو اس میں واک آؤٹ کا جذبہ ابھر آئے بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں کہ اپنی

رائے کے مخالف بھی حق نظر آئے تو گردن جھکادیں۔ پس آزادیٔ ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجک محسوس نہ کریں اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آجانے کے بعد مان لینے میں تامل تک نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس آزادیٔ ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد ہی فضاء پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی آزاد فضاء میں تعلیم بھی ہوگی تو آزاد اور نظم و نسق بھی ہوگا تو آزاد اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہونگے تو آزاد ضمیر، جو آزاد ہی ماحول پیدا کردینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے پس اس اصول سے حضرت والا نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہو گئی۔

پھر اس تالیف خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا بلکہ رائے اور مشورہ کا دروازہ ہر وارد و صادر (آنے والے) ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لیے کھلا رکھا جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو۔ گویا علاقہ خواص میں رابطۂ عوام کو فکری حد تک بھی چھوڑا گیا تاکہ ادارہ چند مخصوص اہل الرائے کی آراء میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقہ کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہوجائے جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضعف و اختلال کا سبب ہوتا ہے۔ اور بالاخر نظم میں محدودیت و استبداد پیدا ہو کر جماعتی تعصب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہوجاتے ہیں جو آزادی کے حق میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہ آزادی کا ایک بھاری پتھر ہٹادیا گیا جو اصول آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

فکری وحدت کا اہتمام

۴۔ ــــ مرکز میں مربیوں اور کارکنوں کا اتحاد مشرب لازمی قرار دیا تاکہ اتحاد خیال سے

جماعتی نظم متحد اور مستحکم رہے ورنہ درصورت اختلاف مشرب، تقابل باہمی، پھر اس سے خود بینی و خودستائی اور اس سے دوسروں کی توہین و آزار رسانی کے جراثیم ابھر کر جماعتی نظم اور داخلی دلجمعی اور جماؤ کو تہ و بالا کردیتے ہیں۔ انتظامات میں پارٹی فیلنگ شروع ہوجاتی ہے جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو اور زیادہ مستحکم کردیتی ہے جو ایک آزادی پسند اور حریت طلب جماعت کے لیے سم قاتل ہے۔

اس لیے حضرت والا نے اس غلامی شکن اصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرمادیا (رکاوٹ دور کردی) یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کرلی جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہوجاتی ہے۔

تعلیمی نظام کا متوازن انداز

۵۔ تجویز نصاب، مقدار خواندگی اور اندازِ تعلیم کو اس اصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا جس میں وسعت نہ ہو اور نہ عامۃ الناس کے عامیانہ آراء و قیاسات (اندازوں) کے تابع کیا جو عقلی تقاضوں اور مقتضیات وقت سے معری (خالی) ہو بلکہ مشورۂ خاص اور انہی اہل علم اور اہل تجربہ کی رایوں پر مبنی رکھا جو مثل علماء روزگار خودبین اور دوسروں کے درپے آزاد نہ ہوں تاکہ تعلیم آزاد بھی رہے اور اس میں عامۂ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظ نظر رہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی آزاد مگر مطابق حالات و مقتضیات تعلیم سے دل و دماغ بھی آزاد مگر پابند حدود ہی پیدا ہوسکتے تھے۔ اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جاسکتی تھی جو ملک کی ساری قوموں کے لیے قابل قبول اور اپنے اپنے دائرہ میں نفع بخش ہو جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا، پس اس پانچویں اصول سے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کردی گئی جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر

لے آئی گئی۔

یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی کانسٹی ٹیوشن بنا کر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلانہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونستا ہے اور متعصب فرقہ تعصب آمیز کورس سے دل و دماغ کو تنگ نظر بناتا ہے۔ انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آجاتا ہے، انقلاب اور تعمیر جدید میں اسی کی ذہنیت کارفرما ہوجاتی ہے متعصب تھا تو انقلاب و تعمیر میں تعصب و تنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں اور فرقہ پرست تھا تو فرقہ پرستی کے۔ اس لیے حضرت والا نے نصاب کو کوری (بے مقصد) آزادی و بے باکی اور خالص بستگی و غلامی دونوں ذہنیتوں سے الگ رکھ کر درمیانی رکھا جو دل و دماغ میں ہر طبقہ کے لیے گنجائش اور وسعت پیدا کرسکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہوسکتا تھا۔

سرمایہ پرستی کے اثرات سے حفاظت

۶۔ عطیات اور چندوں کے سلسلہ میں امراء پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا ہے تاکہ ذہنی مرعوبیت اور اسیریٔ دل و دماغ کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں۔ اور ادارہ خودغرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے جو ذہنی ہی نہیں خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کی دعووں سے فضاء عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں یہی سرمایہ دار پارٹی اپنے سرمایہ اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں حارج ہوتی ہے۔ حضرت والا نے اسے اس وقت محسوس کیا جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رسمی

سوال دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر پیدا ہونے والا تھا۔

حضرت والا اپنے نور فراست اور اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں اور اب بھی وہی آگے آئیں گے اس لیے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقہ کو جسے وہ اس ادارہ میں تیار کرنا چاہتے تھے۔ سرمایہ دار طبقہ سے بے نیاز بنا کر الگ کر دیا تاکہ ادھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ رہے اور ادھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے۔ کیونکہ ایک صورت تو اسے بدکا کر اور اس سے رقیبانہ تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی۔ اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کر دینے کی تھی جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کامیابی موہوم اور فساد یقینی تھا اور دوسری صورت میں کامیابی یقینی اور امن و اصلاح کے ساتھ، نیز پہلی صورت میں شور و شر اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کار برآری زیادہ ہے اور دعووں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلہ کی دعوت دینا ہے اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔

حضرت والا نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی جو امن و سلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے کیونکہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اتاری گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ استغناء سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں کر سکتا۔ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہشمند درحقیقت سرمایہ کا خواہشمند ہے جو اپنے رقیب کو راستہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکتی ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غرباء کی

ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہو گئی تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہو گئے۔ اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لیے حضرت والا نے ادارہ کی آمدنی تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سروسامانی، توکل اور استغناء کا اصول رکھ کر ادارہ کو غریبانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے تاکہ کارکنوں میں تو سرمایہ اور سرمایہ کا غرور پیدا نہ ہونے پائے اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے وہ ادھر جھک جائیں جس سے ان کے غرور میں کمی آجائے اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات نہ پیدا ہوں جس سے اولاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے اور پھر خارجی آزادی کے امکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔

پس حضرت والا نے اس اصول کے ذریعہ حصول آزادی کی ایک اور منزل قریب کر دی مگر مادیت کے راستہ سے نہیں بلکہ روحانیت و اخلاق کے راستہ سے۔

سامراجی اداروں و حکومتوں کی امداد قبول کرنے سے اجتناب

۷۔ ادارہ کے لیے گورنمنٹ کی امداد کو مضر بتلا کر اس سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمائی اور اس طرح ادارہ کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے کیونکہ اقتصادی غلامی ہی بالآخر سیاسی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے اس لیے اس ساتویں اصول سے اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اسی کو ترک موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں بسلسلہ تحریک خلافت اور پھر بہ سلسلہ تحریک آزادیٔ وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بدیشی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا۔ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بدیسی سامانوں

کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرکے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں تاکہ خود اپنے ملک کی تجارت و صنعت ترقی پائے اور ملک ہر سامان میں غیر ملکوں کا اقتصادی محتاج و غلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہوجائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں۔ ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی درآمد بند رکھی گئی جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ تھی تاکہ یہ قومی ادارہ اپنی ضروریات میں خود کفیل رہے۔ اور قومی ہے تو قومی ہی سرمایہ سے چلے اسے غیر قومی رنگ کے سرمایہ کا دست نگر بن کر اقتصادی غلامی کا شکار ہونا نہ پڑے جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بنا رہے بہرحال جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا۔ وہی اس سرکاری ایڈ سے احتراز اور قومی سرمایہ میں محدود رہنے میں مخفی تھا۔ صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔

اس لیے حضرت والا کی دوربین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا۔ اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری سے اجتناب

۸۔ اس آٹھویں اصول میں کارکنان ادارہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے جیسا کہ چھٹے اصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ اس دفعہ کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ کے سلسلہ میں غرباء کے تعاون اور موالات کو اصل رکھا جائے اور انہی کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارہ کے لیے یہی پائیداری اور پختگی کا سامان ہے گویا اس دفعہ کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برادری کا قیام ہے مگر غیر رسمی طور پر بلاانداز تقابل و رقابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں اقلیت (یعنی مالی طور پر کمزور) ہی میں رہے

ہیں۔ اور یہی وجہ ان سے بعد اور تنفر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کو ضرورت کی حد تک بھی سرمایہ سے محروم کیے رہتے ہیں اس کا ثمرہ یہ نکل سکتا ہے کہ جب یہ اکثریت اپنے کمال قناعت و توکل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہوجائے تو قدرتاً سرمایہ دار اس کے محتاج ہوجائیں گے۔ اور وہ بشوق و رغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاموں پر لاکر نثار کرنے کے آرزومند ہوجائیں گے جس سے سرمایہ داروں کا سرمایہ خود بخود باہر آجائے۔ اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔

اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سر پر ایک کاری ضرب ہے مگر موافقت اور مدارات کے پیرایہ میں جس سے ان دو طبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کا روڑا بنے۔ اس لیے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ فتح ہوجاتا ہے۔

آزاد قومی نظام تعلیم کی بنیاد

۹۔ یہ حضرت کے آٹھ حکیمانہ اصول کی تشریح تھی۔ لیکن غور کیا جائے تو ایک نواں اصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ تنظیم مدارس کا اصول ہے۔ کیونکہ عنوان بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارس چندہ کو ان ہی اصول ہشت گانہ کے نیچے جمع کرکے انہیں ایک دوسرے کا شریک ٹھہرایا گیا ہے جو رابطۂ مدارس کی ایک معقول اور مؤثر صورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ مدارس کے فضلاء کا قدرتی رابطہ ہے۔ اس لیے اس اصول میں تنظیم مدارس کے راستہ سے علمی فضلاء اور ان کے حلقہ ارادت کی تنظیم کردی گئی ہے۔ جو انقلاب اور آزادی کے لیے خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر حضرت والا نے صرف نظری ہی طور پر یہ اصول نہیں بتلادیا بلکہ عملی طور پر ان ہی اصول ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔ گویا ۱۸۵۷ء کے بعد آپ کی

مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کیے جائیں اوران میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کیے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعوی لے کر اٹھے کہ:

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں"

تو ان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ:

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں"۔

چنانچہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لیے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا تو مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا، سنبھل میں مدرسہ عربیہ الگ قائم کیا۔ امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاوٹھی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ ابنہٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔

غرض جہاں جہاں حضرت والا خود پہنچے وہاں خود اور جہاں ان کے خدام اور متوسلین پہنچے وہاں ان کے واسطہ سے بتاکید تمام آزاد مدرسے قائم کرائے جس سے اطراف ملک میں بکثرت مدارس قائم ہوئے پھر ان مدارس کے نقش قدم پر اور سینکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں۔ جس سے آپ صرف بانیٔ دارالعلوم دیوبند ہی ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس نوعیت خاص کے لحاظ سے بانیٔ مدارس ہند ثابت ہوتے ہیں اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصول ہشت گانہ سے وابستہ کرکے جس کی صراحت عنوان بالا میں ہے ان مدارس کی روحانی تنظیم بھی فرمائی جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہوگئے اور ایک تنظیمی مذاق (مزاج) لے کر ابھرے۔

دارالعلوم کے تیار کردہ افراد کا جہاد حریت

چنانچہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار جماعتیں رسمی

طور پر بھی منظم ہو گئیں۔ اور انہوں نے جمعیتہ العلماء کے نام سے جنگ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جو شاندار سیاسی خدمات انجام دیں اور جو جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔

جمعیتہ العلماء کے افراد پر شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے لیکن اس کے اصول و مقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس کی عظیم خدمات نکتہ چینی سے یقیناً بالاتر ہیں۔ اگر یہ علماء کی جماعت اس تنظیم مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی تو عوام کا اس طرح جوق جوق آوازہ آزادی کا خیر مقدم کرنا عادۃً مشکل تھا۔

اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے اور اس کے لیے مذہبی آواز ہی میں جذب و کشش ہے وہ کوری سیاسی آواز پر گوش پر آواز نہیں ہوتا اسی لیے علماء کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا اللہ و رسول کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پڑے اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی جو مدارس کی صورت میں اس وقت سے منظم تھے جب کہ اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصورات سے خالی تھے۔

یہ غیر رسمی مگر رسمی سے زیادہ پائیدار تنظیم حضرت والا ہی کے ان اصول ہشت گانہ اور طرز عمل سے ہوئی جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے ہوئے تھے۔ اور جونہی اس مدارسی تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا یعنی جمعیتی پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے دونہی عوام سے سیاسی میدان بھر گئے اور جوش و خروش کے حیرت ناک منظر سامنے آگئے جس کی شہادت تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادیٔ وطن دے سکتی ہے۔

بہر حال حضرت والا نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدان شاملی میں مسلمانوں کی ہر جہتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کا تیر بہدف علاج آزادی کے انہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہوسکتا تھا جو بناء مدارس اور

تعلیمی نظام کی لائن سے بروئے کار لائی گئی۔ حضرت نانوتوی کی سوانح مخطوطہ کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی حتی کہ مخالفین تک بھی اس وقت جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جارہا تھا۔ اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملت کے گئے ہوئے وقار کی بازیافت (دوبارہ حصول) کے لیے ان اصول سے بہتر تیر بہدف نسخہ دوسرا نہیں ہوسکتا جن کے سامنے دلی کی ویرانی اور اس کی مرکزی جہت کے تباہ ہوجانے سے پورے ملک کے حال اور مال کی تباہی عیاں تھی۔ صاحب سوانح مخطوطہ (حاجی فضل حق مرحوم) نظام مدرسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور جو فوائد معاش و معاد (دنیا و آخرت) کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظام تعلیم سے) حاصل ہوئے اور ہوں گے وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لیے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لیے (جنھوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور مجرب نسخہ کوئی نہیں"۔

گویا اس دور میں بھی جبکہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملتی تھی محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا ناواقف تھی، ان اصول کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کیا جاچکا تھا اور مخالفین تک کی طرف سے اعتراف کیا جارہا تھا۔

آج کی اجتماعی مساعی کے سلسلہ میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے اور جن پر چل کر اس نے بدیسی غلامی سے نجات پائی وہ سر مو (بالکل) ان اصول سے متجاوز نہیں ہیں جو حضرت والا تقریباً ایک صدی پیشتر ۱۸۵۷ء کے بعد اجراء مدرسہ کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے اور عین اس وقت جبکہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد و طبقات اپنی زندگی حکومت متسلطہ کے رحم و کرم پر ڈال

دینے اور اس کی حمایت و وفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراج کمال سمجھے ہوئے تھے اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

حضرت نانوتوی کی دور اندیشی

پھر حضرت والا نے ان اصول پر اس وقت اس ادارہ (دارالعلوم) کی بنیاد رکھی جب ملک کے بارسوخ طبقات، بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف منشاء حکومت کی تکمیل اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراک عمل کے اصول ہی پر رکھ رہے تھے بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہد و سربکف علماء و مفکرین کے ساتھ تحقیر و تمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جارہا تھا۔

گویا "اینٹی ملازم" کا پروانہ بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جارہا تھا، لیکن حضرت والا کے ان اساسی اصول پر قائم شدہ نظام میں جہاں بدیسی اقتدار کی شکست و ریخت کے نتائج مخفی تھے وہیں ان میں سے اس تحقیر و تمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوت بھی مضمر تھی کیونکہ ان اصول کا حاصل رابطۂ حکومت نہ تھا بلکہ رابطۂ عوام کا استحکام تھا، اور ۱۸۵۷ء کے بعد متسلطہ اقتدار کے خلاف مشینی قوت کے بجائے عوامی قوت ہی مؤثر ثابت ہوسکتی تھی جسے حضرت والا نے پرکھ لیا تھا جس کو اس زمانہ ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے اور جب کہ یہ عوامی قوت براہ راست انہی علماء کے ہاتھ میں تھی اور ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جھکتا جو اس عوامی قوت پر قابض اور اسے جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہیئے تھا کہ جن علماء کو نکما اور بیکار یا قوم پر ناحق بار باور کرایا جارہا تھا جونہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں یا عوام کی قوت سے حکومت متسلطہ کے اقتدار کے خلاف عصبیاتی جنگ کا آغاز ہوا وونہی "اینٹی ملازم" والے طبقات ملاؤں کی طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ اور اسٹیجوں پر وہی تمسخر و نفرت اظہار عقیدت و نیاز

میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی علماء جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اصول کے زیرسایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے خاموش بیٹھ گئے تھے۔ وہ بالاخر اسٹیجوں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چار و ناچار ان کے کار آمد ہونے کو تسلیم کرلیا گیا اور پھر عوامی تحریکات اکثر و بیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔

علماء کا کارنامہ آزادی

ان اصول کے زیر اثر تربیت پانے والے علماء بالاخر آزادیٔ ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے۔ اور جو کام میدان شاملی کی تلواروں سے پورا نہ ہوسکا تھا وہ امن کی زبان و قلم سے پورا ہو گیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند نے جو مسجد چھتہ کے عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر تھے حاجی محمد عابد صاحب رحمہ اللہ تعالی کے اس خطبان کے ذکر پر کہ "اب ہندوستان کی حکومت، انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کا استخلاص بظاہر ممکن نظر نہیں آتا"

ارشاد فرمایا:

"حاجی صاحب آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں"

یعنی تشدد اور تلوار کے راستے سے نہیں جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے بلکہ امن اور عدم تشدد کے راستہ سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے عدم تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لیے ہوئے تھے اور حضرت نانوتوی نے اس خاکہ کو ان اصول ہشتگانہ کی دفعات میں تعلیمی رنگ سے بھر دیا جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے

ہوئے تھے۔ اور بقول صاحب سوانح مخطوطہ مخالف بھی معقول اور موثر تسلیم کر چکے تھے۔

اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے آخرت کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کے ساتھ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیتہ علماء ہند نے اپنی مشہور تصنیف "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔ نیز دوسرے اہل قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ملک کے استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ انہی مجاہدین شاملی نے بنایا اور ۵۷ کے بعد ان کے پیشرو حضرت اقدس مولانا نانوتوی تھے جن میں یہ جوش امتیازی شان سے ابھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے اس جوش کو ہوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان اصول ہشت گانہ کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا جو اس اقامتی تربیت گاہ (دارالعلوم دیوبند) کے لیے آپ نے وضع فرمائے۔

اساسی اصولوں کی اہمیت

دارالعلوم کے ان فضلاء کے ذریعہ جنہوں نے ان اصول کے زیر سایہ تربیت پائی یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقہ کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا ذہن ہی یہ بن گیا اور عوامی رابطہ کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی ان تربیت یافتوں کے راستہ سے سو برس پہلے کی ہنڈیا کا ابال چھلکا تو چولہے کے گردوپیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر کے رہا۔

مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی فرمایا کرتے تھے جس کو احقر نے خود بلاواسطہ سنا کہ:

"میں نے حضرت نانوتوی کے اصول کی قدر و قیمت یورپ جا کر سمجھی، بالخصوص یورپ و ایشیاء کے متعدد انقلابات کی بنیادوں کو میں صرف انہی اصول کی روشنی میں پاسکا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم

جلدیں تیار کردوں گا"۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۴ء میں جب بسلسلہ تحریک خلافت، دیوبند تشریف لائے اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والا ماجد رحمہ اللہ تعالی کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تو حضرت کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دارالعلوم کا سنگ بنیاد ہیں رو پڑے اور غایت تاثر سے بیساختہ فرمایا کہ:

"یہ اصول تو الہامی معلوم ہوتے ہیں ان کا عقل محض سے کیا واسطہ؟"

چنانچہ ان اصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے قلم سے بھی باوجود ذوق اخفاء کے جگہ جگہ ہی الفاظ نکل گئے ہیں کہ "یوں معلوم ہوتا ہے" اور "یوں نظر آتا ہے" اور "ایسا ہوجائے گا" وغیرہ جو ان اصول کے الہامی ہونے کی گویا خود صاحب اصول کی طرف بھی شہادت ہے۔

بہرحال ان اصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے اور اس انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولیں بیرو قدرتاً وہی سمجھے جاسکتے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے جس پر آزادی خواہ طبقے بعد میں آئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول و عمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر رہے۔ بہرحال حضرت نانوتوی نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لیے یہ دارالعلوم قائم کیا تھا جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا مقولہ اس بارہ میں معروف ہے اور رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوچکا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارہ اور اس کے اصول تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی اور زیادہ نہیں صرف نوے سال کی مدت میں جو ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جائز حقداروں کو پامال کرچکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ ضعف اور مظلومانہ فروتنی سے نیچا دکھادیا۔ ہندوستان صف کی طرح لوٹ گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگے قومی حکومت میں اور اس طرح ۵۷ کی ناکامی کی تلافی ہوگئی۔ گو متسلطہ طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشہ کو بگاڑ دینے کے کافی سامان فراہم کردیئے جن کا بگاڑ کافی نمایاں

ہوا۔ اور ابھی تک ہے لیکن جن اصول کی صداقت نے اصل نصب العین کو رونما کیا تھا انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ (انسداد) کی بھی کفیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان اصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

دار العلوم کا عملی پروگرام

پھر اصول ہی نہیں مدرسہ کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والا نے وہی "تلافی" والا نصب العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فن سپہ گیری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لیے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا۔ جس سے طلبہ میں جسمانی قوت قائم رہے۔ اور اعلاء کلمتہ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا رہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ مدرسہ عربیہ کیا ہوا، مدرسہ حربیہ ہو گیا، تو حضرت والا نے بقول صاحب سوانح مخطوطہ اس پر مبسوط تقریر فرمائی اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

دوسری طرف قومی محکمۂ قضاء قائم فرمایا تاکہ متعلقین مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقۂ اثر میں عدل و قسط اور انصاف پسندی قائم کہنے کے ساتھ ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملہ میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ ابھرا رہے۔ چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس تحریری معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں اہل دیوبند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارہ میں عہد کرایا۔ ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ

"کوئی مقدمہ یا معاملہ جس میں فریقین مسلمان ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسم صاحب تھے"

چنانچہ سینکڑوں مقدمات جو برسہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوالتوں میں الجھے پڑے تھے۔ منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری چھتہ کی مسجد میں قائم ہوئی،

معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی تو فصل خصومات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالی صدر مدرس دارالعلوم کے سپرد فرمایا گیا۔ اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا۔ اس سلسلہ کا کام بڑھا تو اسی نسبت سے دیوبند کی سرکاری منصفی کی رونق گھٹنی شروع ہو گئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا کہ متسلطہ قوت کا اثر و رسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

اسی کے ساتھ حضرت والا نے دارالعلوم میں صنعت و حرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے تاکہ ادارہ کے فضلاء معاشی ضروریات میں خود کفیل بننا سیکھیں۔ بظاہر یہ مقابلہ تھا اس رو کا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطہ نظر ملازمت تھا اور وہ بھی سرکار کی جس کا مال اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا تھا کہ اسکولی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں۔ اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا رد عمل صحیح معنی میں یہی ہوسکتا تھا کہ لوگ اس غلامی آموز تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں جو غناء و استغناء کا جوہر پیدا کرے اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے سرکاری ملازمتوں سے الگ سے رہ کر صنعت و حرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دارالعلوم ایک قومی ادارہ

ایک طرف دارالعلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہوسکیں، چنانچہ دارالعلوم کی ابتدائی روداد میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت والا کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلاتفریق مذہب و ملت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم کو عنایت کریں۔ چنانچہ سب سے پہلے اس صدا پر لبیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی اور وہ منشی نول کشور مالک مطبع لکھنؤ تھے۔ جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات

کا ایک ایک نسخہ دارالعلوم میں بھیجا۔ جس پر دارالعلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ و دعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لیے دارالعلوم کی مجلس شوری منعقد ہوئی جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے اور شکریہ کی ایک مستقل تجویز پاس کرکے ان کے پاس بھیجی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا اس ادارہ کو عوامی ہی نہیں بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل ہیں گویا ہندو مسلم اتفاق کا پروانہ بھی ڈال دیا گیا۔

دارالعلوم کا عالمی کردار

سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والا اس دارالعلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے جس مین اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارہ اور اس کی تحریک کے لیے حاصل ہوں بلکہ اسے عالم گیر بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس علمی حلقہ کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے بھی جوڑنا چاہتے تھے چنانچہ ٹرکی کی خلافت کے جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی انتہائی شدومد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبدالحمید خان والی ٹرکی کی مدح میں قصائد لکھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی ہمدردی پر ابھارا۔ حتی کہ جب ٹرکی کی جنگ اس سے ہوئی تو حضرت والا نے ٹرکی کے لیے چندہ شروع کیا اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ، اپنی اہلیہ محترمہ کا تمام جہیز کپڑا، زیور برتن سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لیے قربان کردیا۔

تحریک دارالعلوم کا نصب العین

اس سے اندازہ کرلیا جائے کہ اس دارالعلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی،

اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خودمختاری، حق خودارادیت، معاشی استغناء، وسائل قوت کی فراہمی، رابطۂ عوام، تالیف خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کارفرما تھے۔ اور دارالعلوم کی تاسیس ایک خاص مکتب فکر کی تاسیس تھی جیسا کہ حضرت والا کے اصول ہشت گانہ اور جاری کردہ نظام کار سے واضح ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ کے کارکنوں اور پروردوں میں استغناء کی روح پھونکتے ہوئے انہیں حکومت وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے۔ ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غرباء سے پھر افزائش طعام طلبہ کی سعی جو قوم کے غریب بچے ہی ہوسکتے تھے اور ادھر حکومت وقت کی امداد سے کلی استغناء بلکہ ممانعت اور امراء اور جاگیردار پر تکیہ کرکے ان کے فخورانہ عطیات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ حکومت وقت کے علی الرغم رابطۂ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے تاکہ ملک کے عوام اس مدرسہ کو اپنی چیز سمجھیں، اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوکر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں ورنہ محض درس و تدریس کی حد تک تنظیم ملت کے اس نئے خاکہ کی ضرورت ہی کیا ہوسکتی تھی؟

غلط فہمی کا ازالہ

پھر اگر محض مذہبی تعلیم و تعلم ہی نصب العین کی آخری حد تھی تو مدرسہ میں فن سپہ گری کے شعبہ کی قیام کی ضرورت ہی کیا ہوسکتی تھی جسے حضرت والا نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی تو حضرت والا صنعت و حرفت کا شعبہ اس مدرسہ میں قائم نہ فرماتے جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا تو حضرت والا شرعی محکمۂ قضاء قائم فرما کر اعضاء (ارکان) مدرسہ کو اس کا جج مقرر نہ فرماتے جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسے کے کاروبار کی آخری حد ہوتی تو مدرسہ کے چندہ

دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کیے جانے کا کوئی تصور سامنے نہ آنا چاہیئے تھا۔ نہ ہندو مسلمانوں سے بلا تخصیص مذہب و ملت چندے قبول کیے جاتے اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعاء و شکریہ سے ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبار مدرسہ کی انتہائی غرض و غایت محض کتابی درس و تدریس تھی تو حضرت والا اس مدرسہ کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندہ کی بنیاد ڈال کر اور خلیفتہ المسلمین سلطان عبدالحمید خان والیٔ ٹرکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافت ٹرکی سے رشتۂ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔ گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتۂ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے بلکہ بیرونی ملک سے بھی رشتۂ اتحاد کا سلسلہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتب درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا بلکہ حضرت اسے ایک ملی جُلی تحریک کے مرکز کی حیثیت سے قائم فرما رہے تھے جس کے نظام کار میں علم و عمل، معاش و معاد، قوم و وطن اور دین و مذہب کی حمایت و نصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے۔ جو حضرت والا کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسہ کی بنیادوں میں پیوست ہوئے اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارہ کے تربیت یافتہ فضلاء متوسلین میں حسب استعداد و قابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

بہرحال دارالعلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کار اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی کررہا ہے جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شاملی کے میدان سے لے کر آئے اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لیے بقول حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ یہ مدرسہ قائم فرمایا غور کیا جائے تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت سید احمد شہید بریلوی سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی۔ اور حاجی صاحب کے لوگوں میں بالاخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قلب و دماغ کا جوہر بن گئی جنہیں

حاجی صاحب نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا۔ اس لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ہجرت کرجانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقاء و ترویج اور اظہار و اعلان کی توقع ہوسکتی تھی اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارہ کے اصول و نظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

بہرحال ان اصول ہشتگانہ کے مرکب نصب العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام دارالعلوم دیوبند ہے اور جس نے بالاخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی موعود تلافی کر دکھائی۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں بالاخر دنیا اس کے نصب العین پر آکر رہی۔ اور آزادیٔ ملک و ملت کے لیے جو خاموش رہنمائی اس نے کی وہ اشتہاروں، پوسٹروں، رسالوں اور اخباروں اور عمومی پروپیگنڈوں کے شور محشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لیے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منارہی ہے اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیئے جارہے ہیں ہم نے مناسب سمجھا کہ ان اصول کے تذکرہ سے یاد منائیں جن پر چل کر دنیا آزادی کی منزل پر پہنچی اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواعی آزادی کا نہ صرف جذبات بلکہ اصول کے درجہ میں بھی امین تھا۔ اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو ہو کر ملک کا ذہن آزادی پسند اور حریت طلب بناتے رہے۔ تا آنکہ آزادی سامنے آکھڑی ہوئی اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقعہ ملا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

۱۵ اگست ۱۹۵۷ء

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کی دستیاب مطبوعات

☆ ہماری دعوت	
☆ قرآنی اصول معاشیات	——— مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
☆ فرد اور اجتماعیت	——— // // //
☆ اخلاق و معاشیات کا باہمی ربط	——— // // //
☆ غلبہ دین اور عبادات	——— چوہدری افضل حق مرحوم
☆ ثناء خداوندی	——— // // //
☆ شعوری تقاضے	——— مولانا شوکت اللہ انصاری
☆ عبادت و خلافت	——— مولانا قاری محمد طیب قاسمی
☆ دینی تمدن کی تشکیل نو	——— // // //
☆ انسان اور نفسیاتی عوامل	——— مولانا محمد تقی امینی
☆ اجتماعی مسائل کا ولی اللہی حل	——— جناب محمد مقبول عالم (مرحوم)
☆ ولی اللہی نظام فکر	——— مفتی عبدالخالق آزاد
☆ مولانا محمد الیاس دہلوی کا تصور دین	——— مفتی سعید الرحمٰن
☆ دین وحدت	——— مولانا سید سلیمان ندوی
☆ ولی اللہی تحریک	——— مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ
☆ ولی اللہی جماعت کا انقلابی کردار	——— مفتی عبدالخالق آزاد
☆ دین اور حکومت	——— مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ
☆ جہاد کیا ہے	——— // // //
☆ امام شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ (افکار و خدمات)	——— مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ
☆ اسلام کے اقتصادی نظام کا تقابلی جائزہ	——— مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
☆ جدوجہد اور نوجوان	——— شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ
☆ دین حق اور برصغیر کا سامراجی نظام تعلیم	——— مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ملنے کا پتہ: (۱) پی او بکس نمبر 363 جی پی او ملتان

(۲) مقصود حسن عزیز جبل کیشنز 56 میکلوڈ روڈ لاہور